فلسفہ، علم اور قرآن

پیرایہ ماضی کی کہانی

الشیخ ندیم الجسر

اس کے بعد دیموقریطس[1] آیا جس کی طرف ذری مذہب کو منسوب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: عالم کون ذرات (ATOMS) کی غیر متناہی تعداد سے بنتا ہے۔ یہ ذرات ایک دوسرے کے متشابہ، ہم جنس، ازلی، ابدی اور خلا میں متحرک یا اثرات ہوتے ہیں۔ ان کی حرکت اور اختلاط سے ہی اشیاء اور تمام عالم بنا ہے۔ اشیاء کی صفات کا اختلاف ان ذرات کے باہم ملنے، ترکیب پانے، ان کے جسمانی اوضاع اور ان کی طرف دیکھنے والوں کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ ان قدلت کے ابدی اور ازلی ہونے پر اس کی دلیل یہ ہے کہ وجود لا وجود سے پیدا نہیں ہوتا جس طرح وجود لا وجود نہیں ہوتا۔ اور اگر ان کا وجود خلا میں نہ ہو تو ان کے لیے حرکت کرنا ناممکن ہو جائے۔ اسی لیے تو وہ یہاں تک کہہ گیا کہ موجودات کے اندر تین ازلی حقائق ہیں۔ یعنی ذرات۔ فراغ (خلا) اور حرکت۔

حیران:۔ ذرات سے عالم مادی کے پیدا ہونے میں کوئی بعید از عقل بات نہیں پائی جاتی لیکن ان ذرات کو کس نے پیدا کیا اور کس نے ان کو متحرک بنایا؟

شیخ:۔ تمہارے سوالوں کا جواب دیموقریطس کے لیے مقدر نہ تھا بلکہ وہ کسی اور کے لیے مقدر تھا لیکن وہ سلامتی فکر سے خالی ہو گیا، جب اس نے یہ خیال کیا کہ ذرات کی حرکت ایک ایسی اندھی ضرورت کا نتیجہ ہے جو انہیں حرکت، ایک دوسرے

---

(۱) دیموقریطس تقریباً ۴۶۰ تا ۳۷۰ قبل مسیح۔ یہ اس بات کا قائل تھا کہ ہر قسم کا جوہر ذرات پر مشتمل ہے یعنی غیر مرئی اور لاینجزا اجزاء پر۔ ان ذرات کی مختلف صورتیں مختلف مادی صفات کی سبب بنتی ہیں وہ ذرات جو نہایت باریک اور نہایت ہموار ہوں ان سے ذہن کا مادہ تیار ہوتا ہے (ڈکشنری آف فلاسفی: ۵۰)

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

سے نئے باہم گڈمڈ ہونے امتزاج، اور اس کون کو مع اس کے جمادات، نباتات اور حیوانات کے پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے حتیٰ کہ اس کے نزدیک ارواح اور دیوتا بھی ان ذرات سے مرکب ہیں جو اس اندھی ضرورت کی قوت سے چلتے ہیں۔

دیموقریطیس کے بعد اناکساغورس[2] آیا تو اس نے "اندھی ضرورت" کے متعلق دیموقریطیس کی آراء کو احمقانہ اور سفیہانہ قرار دیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے مؤمنین میں سے ہے: اس اندھی قوت کے لیے یہ ناممکن ہے کہ اس جمال اور اس نظام کی ایجاد کرے جو اس عالم میں جلوہ نما ہیں۔ اس لیے کہ اندھی قوت سے تو صرف انارکی اور انتشار پیدا ہوتا ہے اور مادہ کو تو عقل رشید بصیر اور حکیم حرکت میں لاتی ہے۔

حیران:۔ یہ بہت بڑی بات ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ اناکساغورس نے ان اقوال سے اللہ کے وجود کو ثابت کرنا چاہا ہو۔

شیخ:۔ حیران! میں نہیں جانتا کیونکہ اپنے رسولوں کی زبان سے اللہ کی ہدایت یونان اور فلسفۂ یونان سے بھی پہلے آ چکی ہے بلکہ میرے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ مصر، چین، اور ہندی فلسفہ قدیم کا بہت سا حصہ ان نبوتوں کی یادگار ہے جسے تاریخ بھول چکی ہے لہٰذا یہ لوگ فلسفیوں میں شمار کیے گئے، ہو سکتا ہے کہ یہ بھی رسولوں میں سے یا ان کے تابعداروں میں سے ہوں۔

لیکن اناکساغورس کے اقوال سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نے اپنی عقل سلیم سے یہ معلوم کر لیا کہ یہ مضبوط نظام عقل حکیم کے سوا کسی اور چیز سے صادر نہیں ہو سکتا تو وہ اس ایمان کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکساغورس پہلا شخص شمار کیا جاتا ہے جس نے فلسفہ روحیہ کا دروازہ کھولا اور جس نے ایسی رائے پیش کی جو حق کے گرد چکر لگاتی ہو۔ اسی وجہ سے ارسطو نے اس کے متعلق کہا ہے کہ یہ تنہا شخص ہے جو اسلاف کی بکواس کے مقابلہ میں راہ ہدایت پر قائم رہا۔

---

(۲) اناکساغورس تقریباً ۵۰۰ ق م قبل مسیح۔ وہ بھی درمیانی عمر کا ہی تھا کہ یہ ایتھنز میں آباد ہو گیا لیکن بعد میں اس پر ناپاک ہونے کا الزام لگا کر شہر سے نکال دیا گیا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ مادہ: وہ لا انتہا پائے جاتے ہیں یعنی وہ مادہ جو بالعموم اسی قسم کے اجزاء میں منقسم ہو جائے یہ بیج تمام کائنات میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں، ان کے ایک دوسرے سے ملنے سے انفرادی اشیاء بنتی ہیں اور ان کا جدا جدا ہونا انفرادی اشیاء کا فنا ہونا ہے ان ذرات کی حرکت کے سبب کی توجیہہ کرتے ہوئے انکساغورس کو ایک قسم کے مادہ کا خیال آیا جو اکیلا اور بذات خود متحرک ہے اور اس حرکت کو دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ (ڈکشنری آف فلاسفی، ۱۲)

حیران:۔ الحمدللہ کہ ہم اب ایسے فلسفے کے طلوع تک پہنچ گئے ہیں جو یاوہ گوئی سے بلند و بالا ہے۔

شیخ ۔ بیشک فلسفہ حق کی طرف چل رہا ہے لیکن ایسی سست رفتار کے ساتھ جس میں کبھی شک کرنے والے الجھن میں ڈال دیتے ہیں علاوہ سوفسطائی (باطل استدلال پیش کرنیوالے) جو اپنے غلط استدلالات سے ہر قسم کے فکر سلیم کو ختم کر دیتے ہیں۔

حیران:۔ میں نے سفسطہ کا لفظ سنا ہے جس سے دھوکا دینے والا استدلال مراد لیا جاتی ہے۔

شیخ:۔ ہاں لفظ سفسطہ سوفسطائیت سے نکلا ہے۔ سوفسطائیت ان لوگوں کا طریقہ ہے جو غلط استدلال کے ذریعہ لوگوں کو حقائق کے پلٹنے کی تعلیم دینے میں ماہر تھے۔ ان کا یہ نام لفظ سوفیسٹ (SOPHIST) سے لیا گیا ہے یونانی زبان میں اس سے مراد معلم لی جاتی ہے خواہ وہ کسی صنعت اور علم کی کسی شاخ کا معلم ہو۔ پھر یہ لفظ ان معلّمین کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ عربوں نے اسی سے سفسطہ کا لفظ گھڑ لیا۔ سوفسطائیوں کا نہ کوئی معین فلسفی مذہب ہے اور نہ آراء ہیں جن کا فلسفہ کی روح سے ربط ہو، جو کہ حق کی تلاش کرتی ہے لیکن یہ معلّمین کی ایک جماعت تھی جو یونان میں ایسے اجتماعی حالات میں ظاہر ہوئی جب اس ملک کے اندر شک اور افسانوی دیوتاؤں کے انکار نیز ڈیموقراطی خیالات کی لہر زور پر تھی۔ اس ڈیموقراطی لہر نے لوگوں کے لیے عوام کو بیوقوف بنا کر عہدے حاصل کرنے کے لیے دروازے کھول دیئے تھے۔ انہیں لوگوں کو فنون بلاغت، خطابت، استدلال اور کلام کو آراستہ کرنے کی تعلیم دینے میں مہارت حاصل تھی انہیں اس بات پر گھمنڈ تھا کہ وہ ایک رائے اور اس کی نقیض دونوں کو صحیح ثابت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں یہ اپنی گمراہی میں بہت دور تک چلے گئے یہاں تک قریب تھا کہ ان کا طریقہ عقل، معرفت، اور اخلاق کی دنیا کو تباہ کر دے۔

ان کا سب سے مشہور شخص بروتاغورس[1] تھا۔ اس نے وہ محور وضع کیا جس کے گرد سوفسطائیوں کی تمام احمقانہ باتیں گردش کرتی ہیں چنانچہ وہ کہتا ہے: "انسان[2] ہر چیز کا مقیاس ہے" علماء اور فلاسفہ کی رائے تھی کہ حقیقت کو عقل

---

(۱) بروتاغورس۔ تقریباً ۴۸۰ تا ۴۱۰ قبل مسیح۔ مشہور سوفسطائی اور اپنی فلسفیانہ دانش کے لحاظ سے معروف ہے۔ نحو، منطق، فلسفۂ اخلاق اور سیاست پر کئی ایک کتابوں کا مصنف ہے، یہ کئی بار اثینہ آیا اور بالآخر اسے کفریات کی وجہ سے اثینہ سے نکل جانے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے نزدیک آدمی ہر چیز کو ناپ تول سکتا ہے اس کے اس قول کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ہمیں صرف ان چیزوں کا علم ہوتا ہے جنہیں ہم حواس کے ذریعہ سے معلوم کرتے ہیں۔

(ڈکشنری آف فلاسفی : ۲۵۷)

(۲) MAN IS THE MEASURE OF ALL THINGS (ڈکشنری آف فلاسفی : ۲۵۷)

کے ذریعہ دریافت کیا جاسکتا ہے نہ کہ حس کے ذریعہ اس لیے کہ حواس دھوکا دیتے ہیں۔ پروتاغورس نے آکر عقل کے ذریعہ معرفت حاصل کرنے کا انکار کردیا۔ اس کا خیال ہے کہ ہمارے حواس ہی معرفت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہیں اور چونکہ لوگوں کے جسموں اور عمروں کے اختلاف کی وجہ سے ان کے احساسات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اس لیے حقیقت کو دریافت کرنا ناممکن ہوگیا۔ اور کسی چیز کا صحیح ہونا ایک شخص کی اپنی نسبت سے ہے۔ اور کوئی ایسی چیز نہیں جسے غلط کہنا ممکن ہو۔ اس لیے کہ ادراک کنندہ کے اعتبار سے ہر رائے صحیح ہے عربوں نے اس اصول کا نام جو اس بات کا قائل ہے کہ انسان ہر چیز کا مقیاس ہے "عندیہ" رکھا ہے کیونکہ اس طرح ہر شخص کا اعتقاد اسی بات پر ہوگا جو اس کے نزدیک صحیح ہے

اس کے بعد ان میں سے ایک شخص غورجیاس[۱] نامی آیا۔ اور اس نے یک لخت وجود اشیاء کا سرے سے انکار کرکے سوفسطائیت کو حماقت، بکواس اور مہمل ہونے کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ معرفت اور لوگوں میں باہمی تعارف وتفاہم ناممکن ہے اور تو دیکھتا ہے کہ یہ بکواس اس قدر کمزور اور حقیر ہے کہ اسے فلسفہ کی بحثوں میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ اس میں ایک خوبی ضرور ہے کہ اس نے سقراط کو پیدا کیا۔

حیران: اس بکواس نے سقراط[۲] حکیم کو کیسے پیدا کیا؟

---

(۱) غورجیاس تقریباً ۴۸۰ تا ۳۸۰ قبل مسیح۔ یہ صقلیہ یونتی کا رہنے والا تھا اور مشہور خطیب، فلسفی اور فصیح البیان ہے اس کا شمار سرکردہ سوفسطائیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنی علمی عمر کا بیشتر حصہ یونان میں اور بالخصوص اثینہ میں گزارا۔ افلاطونی سوال وجواب سے جو اس کے نام سے مشہور ہے، پتہ چلتا ہے کہ اس کی کس قدر تعظیم کی جاتی تھی۔

(ڈکشنری آف فلاسفی: ۱۱۹)

(۲) سقراط (SOCRATES) تقریباً ۴۷۰ تا ۳۹۹ قبل مسیح۔ یہ فلسفہ کے باثر ترین معلموں میں سے تھا۔ اس کا باپ سوفرونسکس اثینہ میں سنگتراش تھا اس نے ساری عمر اثینہ میں گزار دی، صرف دو بار فوجی ملازمت کی غرض سے اسے باہر جانا پڑا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ "نیکی علم ہے اور علم صرف اسی وقت سچا ہو سکتا ہے۔ جب اس کی حد اور تعریف کی جاسکے۔" اس کے خیال میں استاد شاگرد کو کوئی معلومات بہم نہیں پہنچاتا لیکن سوالات کے ذریعہ سے صحیح جوابات نکلواتا ہے۔

(ڈکشنری آف فلاسفی: ۲۹۵)

آخر کار اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ یہ ملحد ہے اور نوجوانوں کو خراب کر رہا ہے۔ عدالت نے اسے مجرم قرار دیا اس نے زہر کا پیالہ پی کر زندگی ختم کردی۔

تشریح۔ سقراط ہی تو ہے جس نے فلسفہ معرفت کی بنیاد رکھی۔ جس کا تسلط سلیم عقلوں پر دو ہزار سال سے زائد عرصہ سے لے کر اب تک چلا آتا ہے۔ خواہ اس کے بارے میں کتنی بھی مختلف بحثیں ہوں۔

اے حیران۔ اور فلسفہ سے سقراط کی سوائے اس کے کوئی اور غرض نہ تھی کہ وہ عقل کی بنیاد پر معرفت کے قانون وضع کرے اور سوائے اس کے کہ وہ لوگوں کے سینوں میں اس حق کی بنیاد پر جس میں کوئی شک نہیں فضیلت کو مستحکم کر دے۔ اس مقدس فلسفی نے دیکھا کہ اس کے زمانہ کے لوگوں کے اخلاق ان سوفسطائیوں کے فریب کے سامنے جنہوں نے عقل، حق، یقین اور فضائل اخلاق کا انکار کیا ہے تباہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان سوفسطائیوں نے تمام اصول معرفت کو احساس کے سپرد کر دیا تھا۔ لہذا سقراط نے چاہا کہ اصول معرفت کو اس عقل کی طرف لوٹا دے جس کے مضبوط ہونے پر بغیر اختلاف کے سب لوگ متفق ہیں۔ تاکہ اس طرح وہ فضیلت کی حد بندی اور تعریف مقرر کر سکے۔

سقراط کہتا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ معرفت کی بنیاد حواس پر ہو اس لیے کہ افراد اور حالات کے اختلاف سے حواس بھی مختلف ہوتے ہیں لہذا ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ ہم معرفت کی ایک مضبوط اصل دریافت کریں جس میں لوگ کبھی بھی اختلاف نہ کر سکیں اور جب ہم اپنی معلومات کی طرف دیکھتے ہیں تو ہم انہیں ان جزئی ادراکات پر مشتمل پاتے ہیں جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں نیز ان کلی عمومی ادراکات پر جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں پایا جاتا کہ ان کو حس کے ذریعہ معلوم کیا جا سکے۔ اس کے لیے اس نے ایک مثال بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ "نوع" کے معنی یہ ہیں وہ چیز جسے ہماری عقلیں ان تمام صفات کو جمع کر کے جن میں نوع کے تمام افراد مشترک ہوتے ہیں اور ان تمام عارضی صفات کو ترک کر کے جو نوع کے بعض افراد میں ظاہر ہوتی ہیں ادراک کر سکتی ہیں وہ کہتا ہے کہ کسی ایسی چیز کا یہ ادراک جو نہ تو حواس سے معلوم کی جا سکتی ہو اور نہ خارج میں اس کا وجود ہو، یہی وہ کلی ادراک ہے جس کے متعلق عقلمند انسان کو قطعاً شک نہیں کہ یہ تنہا عقل کا فعل ہے یہ ادراک کلی عقلی ہے۔ اور واجب ہے کہ اسی پر معرفت کی بنیاد رکھی جائے۔ پس جب مدرکات حسیہ جزئیہ افراد، حالات اور اوضاع کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتی ہیں تو وہ عقل جو لوگوں میں عام اور مشترک ہے جب تک سلیم ہو، مختلف نہیں ہو سکتی انہی عقلی اور کلی ادراکات کے ذریعہ ہم ہر چیز کی حد اور تعریف مقرر کر سکتے ہیں اور حقائق کے لیے صحیح اور مستقل معیار مقرر کر سکتے ہیں کہ فضیلت کیا ہے۔

سقراط کے بعد اس کا مشہور شاگرد افلاطون[1] آیا۔ اس نے معرفت کے بارے میں اپنے استاد کے ایجاد کردہ نظریہ

---

(۱) افلاطون: ۴۲۸، ۴۲۷ تا ۳۴۸، ۳۴۷ قبل مسیح۔ یونانی فلاسفہ کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے ہے۔ اس

کی تائید کی اور اسے اور مضبوط کر دیا لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ اس نے مثل یعنی اعیان پر اس معرفت کی بنیاد کیوں رکھی ہے اور ان اعیان سے اس کی مراد کیا ہے؟

وہ یہ کہتا ہے کہ معانی کلیہ کا ادراک حواس کے ذریعہ ممکن نہیں، ان کا ادراک صرف عقل کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً خوبصورتی اور بدصورتی دو ایسے معانی ہیں جنہیں ہم بہت سی ایسی چیزوں میں جن کے مظاہر اور اشکال مختلف ہوتی ہیں، پاتے ہیں۔ ہمیں کس چیز نے یہ بات سجھائی کہ یہ چیزیں جمال میں مشترک ہوتی ہیں اور یہ بدصورتی میں؟ ہمارے حواس اس اشتراک کو نہیں پا سکتے بلکہ یہ ہماری عقلیں ہی ہیں جو مشترکہ اشیاء میں جمال کا باہمی مقابلہ اور موازنہ کرتی اور یہ معلوم کر لیتی ہیں کہ اس میں جمال پایا جاتا ہے لیکن یہ مقابلہ اور موازنہ کرنے کے لیے ہماری عقلوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس جمالؔ خوبصورتی اور قبحؔ بدصورتی کے متعلق پہلے ہی سے محکم فکر موجود ہو اور اگر ہم یہ کہیں کہ یہ فکر ہماری عقلوں کی اختراع ہے تو ہم لوٹ کر پھر سے اس سوفسطائیت کی طرف آ جائیں گے جو حقائق کا قیاس محض شخصی اور انفرادی حیثیت سے کرتی ہے لہذا اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم کہیں کہ ہماری عقلوں سے پرے ان کلی معانی کا وجود پایا جاتا ہے۔ انہی کے لیے افلاطون نے مُثل اور اعیان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے نفوس جسم میں حلول کرنے سے پہلے "عالم مثال" میں رہ رہے تھے لیکن جسم کے اندر حلول کرنے کے بعد یہ عالم مثال کو کسی حد تک بھول گئے، لیکن جب ان کی نگاہ کسی کلی مفہوم پر پڑتی ہے مثلاً جمال اور قبح تو اس کا عین ان کو یاد آ جاتا ہے تو موازنہ کے ذریعہ اشیاء کے جمال اور قبح کو سمجھ جاتے ہیں، یہی حال دیگر کلی معانی مثلاً فضیلت، عدل، خیر، وغیرہ کا ہے لہذا علم ان اعیان کی یاد کا نام ہے اور جہل ان کو بھول جانے کا، اور تجربے تو دنیاوی زندگی میں عقلوں کو جو کچھ انہوں نے اس سے پہلے عالم مثال میں معلوم کیا تھا تنبیہ کرنے اور یاد دلانے کا ذریعہ ہیں۔

حیران۔ مولانا۔ یہ اعیان کیا ہیں۔ اور ان کی حقیقت کیا ہے۔

کی پیدائش اثینہ میں ہوئی یا جزیرہ ایجینہ میں، اس کا اصلی نام ارسطاقلیس تھا، اس کے باپ ارسطون کا سلسلہ نسب اثینہ کے آخری تاجداروں سے جا ملتا ہے۔ اس کی والدہ پرکٹیوں سولون کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ افلاطون نے ابتدائی تعلیم بہترین ممکن طریقہ پر حاصل کی اور بیس سال کی عمر سے لے کر آٹھ سال تک سقراط کی وفات تک سقراط کے حلقہ میں گزارے۔ فلسفہ کی اس کی مہارت کے متعلق اس کے کئی ایک قصے مشہور ہیں اس نے فلسفہ فیثاغورس اور ہرقلیطس کو حاصل کیا اور ۳۸۴ قبل مسیح میں اثینہ میں ریاضی اور فلسفہ کا مدرسہ قائم کیا۔ جسے اکادمی کا نام دیا گیا۔ یہاں اسّی برس کی عمر میں وفات تک یہ درس دیتا ہے۔ یہ اکادمی ۵۲۹ء تک جاری رہی جب جسٹینین نے اسے بند کر دیا (ڈکشنری آف فلاسفی: ۲۲۶، ۲۴۰)

شیخ: تمہیں تعجب کرنے کا حق حاصل ہے اور تم سے پہلے ارسطو بھی تعجب کر چکا ہے۔ کیونکہ افلاطون نے ان اعیان کو ایسے متعدد اوصاف سے موصوف کیا ہے جو نہ ہماری فہم میں آ سکتے ہیں اور نہ عقل میں، البتہ (اس وقت کچھ سمجھ آتے ہیں) اس کی مراد وہ امور ہیں جو اللہ کے علم میں ہوں۔ اے حیران! میں اسی کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ وہ ان اعیان کے متعلق کہتا ہے کہ یہ مادی نہیں ہیں بلکہ محض معانی ہیں، اور ان کے وجود کے عناصر کسی خارجی چیز کے نہیں بلکہ اپنے ذاتی ہوتے ہیں اور یہی تمام اشیاء کی بنیاد ہیں ان کا کسی پر سہارا نہیں بلکہ اوروں کا ان پر سہارا ہے۔ یہ دائمی، مستقل، ابدی، ساکن اور کامل ہیں۔ کوئی زمان و مکان ان کو محدود نہیں کر سکتا۔ کیا تو اس بیان سے سمجھ نہیں گیا کہ افلاطون کی مراد تقریباً وہ امور ہیں جو اللہ کے علم میں ہیں۔

حیران: کیا افلاطون اللہ کے وجود پر ایمان رکھتا ہے۔

شیخ: افلاطون پہلا فلسفی ہے جس کا اعتقاد اللہ کے وجود پر تھا۔ اور یہ کہ وہ جہان کا خالق اور مدبر ہے اور اس پر اس نے دلائل پیش کیے جن میں سے اہم ترین دلیل نظام (عالم) کی دلیل ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ یہ جہاں اپنے جمال اور نظام کے اعتبار سے ایک معجزہ ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یہ اتفاقیہ اسباب کا نتیجہ ہو بلکہ یہ تو کسی عقلمند اور کامل کی صنعت ہے جس نے بھلائی کا ارادہ کیا اور ہر چیز کو ارادہ اور حکمت کے ساتھ ترتیب دی۔

لیکن جب افلاطون یہ بتانا چاہتا ہے کہ اللہ نے اس جہاں کو کیسے پیدا کیا تو اس کی عقل کو وہی مشکل پیش آجاتی ہے جو ہم سب کی عقلوں کو پیش آتی ہے چنانچہ وہ یہ تصور نہیں کر سکتا کہ عدم سے مخلوق کیسے پیدا ہوئی۔ لہذا وہ کہتا ہے کہ اشیاء مادہ اور صورت سے مرکب ہیں، اور یہی صورت مادہ کو معین شے بنا دیتی ہے اور یہ ان اعیان کے اثر کی وجہ سے ہے جو کسی شے کو شکل عطا کرتی ہیں۔ لہذا کوئی شے اپنی عین کی صورت اختیار کرنے سے پہلے ایسا مادہ تھی جس کی نہ کوئی صفت تھی اور نہ شکل، پھر اپنی عین کا نقش قبول کرنے لگی اور اس نے معدوم ہونے کے بعد حقیقی وجود حاصل کر لیا۔ اور وہ اللہ ہی ہے جو مادہ کو اپنی عین کا ڈھانچہ عطا کرتا ہے اور معدوم ہونے کے ذریعہ اسے موجود کرتا ہے۔

حیران: میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ مادہ صورت کا نقش اختیار کرنے سے پہلے کیسے معدوم تھا۔

شیخ: تو نہیں سمجھ سکے گا اور میں بھی نہیں سمجھتا۔ اور خود افلاطون اپنی کامل سلیم اور بلند عقل کے باوجود یہ بات نہیں سمجھا کہ ایک ہی وقت میں کوئی شے کیسے مادہ بھی ہو اور معدوم بھی۔ لیکن دیگر قوی عقلوں کی طرح اس طاقتور عقل کو بھی ان خیالی امور کو ثابت کرنے کی طرف کھینچ کر آنا پڑا بسبب عدم محض سے تخلیق کا تصور کرنے کے عجز سے اور یہ عجز اس دھوکا دینے والے قیاس التمثیل سے آتا ہے جو ہماری ان عقلوں پر مسلط ہے جو عدم سے کسی چیز کے پیدا ہونے کے تصور کی عادی نہیں ہیں۔ یہ لوگ اشیاء کو دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ بدل کر ایک صورت سے دوسری اختیار کرتی ہیں لہذا وہ یہ فیصلہ کر دیتے ہیں

کہ یہ صورتیں حادث ہیں اور یہ عقلی استدلال انہیں ایسے قدیم مادہ کے تصور کی طرف لے جاتا ہے جس کی کوئی صورت نہ ہو، لہٰذا وہ اس بے صورت مادہ کی ماہیت بیان کرنے میں حیرت زدہ ہو جاتے ہیں کہ اس کی نہ صفت ہے نہ شکل نہ رنگ نہ حجم نہ وزن اور نہ ذائقہ ہے نہ بو، اس لیے کہ تمام اوصاف تو شکل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں بالآخر وہ کہہ دیتے ہیں کہ مادہ "عدم" ہے مگر پھر ان کی عقلیں عدم سے جہاں کے پیدا ہونے کے تصور سے عاجز آ جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اس مادہ کو پایا جس کی نہ شکل ہے اور نہ صفت، نیز اس نے ان مجرد اعیان کو دیکھا تو مادہ کو ان اعیان کی شکل دے دی یعنی مادہ کو صورت دی اور وہ ایک معین شے بن گیا۔ گویا وہ ہمیں اس بات کا قائل کرانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کو اس کے مادے سے پیدا کیا جسے وہ عدم سے وجود میں لایا اور عالم کو وہ صورتیں عطا کیں جو اس کے قدیم علم میں تھیں۔ اس کے بغیر ان کا کلام متناقض ہوگا جو نہ سمجھ میں آسکتا ہے نہ عقل میں۔ بہرحال افلاطون نے اللہ کے وجود کو پالیا ہے اور یہ بھی پالیا ہے کہ وہی اپنی قدرت اور حکمت کے ساتھ اس جہاں کا خالق اور اس کے امور کا مدبر ہے لیکن جب اس نے تخلیق کے راز میں داخل ہونا چاہا تو وہ بعینہٖ اسی طرح جس طرح اس کا شاگرد ارسطو قدیم الٰہی فلاسفہ کا سردار پھسلا تھا، پھسل گیا۔

حیران۔ میں جانتا ہوں کہ ارسطو[1] قدیم فلاسفہ میں سے سب سے بڑا ہے، اور وہ علم منطق کا بانی ہے یہاں تک کہ اسے معلم اول کا لقب دیا گیا۔ پھر یہ کیسے پھسل گیا۔

شیخ۔ یقیناً ارسطو قدیم الٰہی فلاسفہ میں سب سے بڑا ہے اور اللہ کے وجود پر اس کا ایمان بھی تھا، لیکن جب اس نے تخلیق کے راز میں داخل ہونا چاہا تو اسے بھی اسی طرح ٹھوکر لگی جس طرح اوروں کو لگی تھی۔ اور اگر تو معرفت کے متعلق اس کی رائے کو غور سے سن لے تو حیران ہوگا کہ یہ مضبوط حکمت والی عقل کیسے پھسلتی ہے۔

---

(۱) ارسطو ٣٨٤ تا ٣٢٢ قبل مسیح۔ یہ مقدونیہ میں پیدا ہوا، مقدونیہ کے بادشاہ امنتاس کا طبیب تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں یہ اثینہ گیا اور وہاں افلاطون کی شاگردی اختیار کی اور تقریباً بیس سال تک اکادمی کا ممبر رہا اس کے بعد کئی سال تک اسکندر مقدونی کا اتالیق رہا۔ ٣٣٥؁ ق م میں یہ اثینہ واپس آگیا، جہاں بارہ سال تک اس مدرسہ کا رئیس رہا جو اس نے لائی سیم میں قائم کیا تھا۔ اس مکتب فکر کو مشائین کہا جاتا ہے۔ ٣٢٢؁ ق م میں سکندر کی وفات کے بعد ارسطو کلیسس واپس چلا آیا جہاں ایک سال بعد اس نے وفات پائی۔ ارسطو نے تقریباً تمام ان علوم پر قلم اٹھایا ہے جو اس زمانہ میں رائج تھے یہی وجہ ہے کہ اس کی تصانیف کثیر التعداد ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ پہلا قدم جسے فکرِ معرفت کی راہ میں اٹھانا ہے وہ "ادراک حسّی" ہے۔ پھر جب ذہن کے اندر ادراکات حسیہ جزئیہ کی ایک مقدار جمع ہو جاتی ہے اور "قوت ذاکرہ" اسے محفوظ کر لیتی ہے تو فکر اس کا تجربہ کرنے کا دوسرا مرحلہ شروع کرتا ہے۔ یہ چیزوں کا باہمی موازنہ کرتا ہے۔ ان کے باہمی تعلق، علل اور اسباب کو معلوم کرتا ہے، پھر یہ فکر تیسرے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے اور یہ مرحلہ "تامل نظری" کا ہے تاکہ وہ نتیجہ نکالنے اور فیصلہ تک پہنچ سکے۔ اور وہ فکری طریقہ جسے عقل ان مرحلوں میں اختیار کرتی ہے یعنی ادراک حسّی سے تجربہ تک پھر موازنہ، تامل، تعلیل، قیاس، استنتاج اور حکم تک وہی فکری منطق ہے جس کے قواعد ارسطو نے مرتب کیے اور اسے علم بنا دیا اور اسی لیے وہ فلسفہ کی تاریخ میں "معلّم اول" کہلانے کا حقدار بنا۔

لیکن اس معلم اول نے جو منطق سلیم کا مؤجد ہے، جب جہاں کی پیدائش کی شرح کرنی چاہی تو اس مادّیت کے تخیل کی گھاٹی میں پھسل جس نے ہماری عقلوں پر غلبہ پایا ہوا ہے۔ اور انہیں اس "قیاس تمثیلی" سے دھوکہ دیتا ہے جس کا انسان عادی ہو چکا ہے بوجہ زندگی میں مادی اشیاء سے ممارست کے، چنانچہ اس کے لیے عدم سے مادہ کی پیدائش کا تصور مشکل معلوم ہوا اور اس نے مادہ کے قدیم ہونے کا دعوٰے کیا۔ اس کے بعد اس کی عقل سلیم نے اسے مجبور کیا کہ وہ یہ اعتراف کرے کہ یہ ناممکن ہے کہ مادہ ایک معین شے ہو۔ اس لیے کہ اس کی کوئی صورت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اس کی تعریف کے بارے میں حیرانی میں پڑ گیا اور آخر کار اس نے کہا کہ مادہ سے مراد اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے گویا اس نے یوں کہہ دیا کہ مادہ سے مراد عدم ہے۔

حیران۔ مولانا! میری عقل تو پریشان ہو گئی للہ وضاحت فرمائیں کہ مادہ سے مراد اثر قبول کرنے کی صلاحیت کیسے ہو سکتی ہے۔

شیخ۔ تم معذور ہو۔ میں عنقریب اس کو ایجاز و بسط سے بیان کروں گا، معاصر فلسفی ہنری برغسون کہتا ہے؟ ہماری عقلوں کے ایک جز کی یوں نشوونما ہوئی کہ مادی اجسام کا ادراک کر سکے۔ لہٰذا اس نے اس مادی ماحول سے بیشتر تصورات حاصل کر لیے۔" اور یہ صحیح ہے اور اس سے بڑی سے بڑی عقل بھی نجات نہیں پا سکتی خواہ ارسطو ہی کی عقل کیوں نہ ہو۔ لہٰذا جب اس نے اس جہاں کی پیدائش کی تشریح کرنا چاہی تو اس نے اس کی اسی طرح تشریح کی جس طرح اسے آلہ کی جاتی ہے۔ جسے انسان نے معین مادہ سے معین ہیئت پر اور معین مقصد کے لیے بنایا ہو۔

چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ہر شے کی پیدائش اور وجود چار علتوں کی تاثیر سے ہوتا ہے۔

(۱) علت مادی اور یہ وہ مادہ ہے جس سے کوئی شے بنی ہے۔

(۲) علتِ صوری اور یہ وہ صورت ہے جس سے مادہ معین شے بن جاتا ہے۔

(۳) علّت فاعلہ یا فاعلی اور یہ وہ علت ہے جو شے کو بناتی اور اسے شکل اور صورت عطا کرتی ہے۔

(۴) علت غائی اور یہ وہ مقصد ہے جس کی خاطر علت فاعلی نے اسے اس ہیئت پر بنایا۔

چنانچہ مثال کے طور پر چارپائی کی علت مادی لکڑی ہے اور علت صوری یہی صورت ہے جو اس لکڑی کو دی گئی اور اس نے اسے چارپائی کی شکل میں بنا دیا، میز کی شکل میں نہیں بنایا اور علت فاعلی وہ بڑھئی ہے جس نے چارپائی تیار کی اور علت غائی، سونا اور راحت ہے۔

اس کے بعد ارسطو نے علت صوری علت غائی اور علت فاعلی کو باہم ملایا اور انہیں ایک علت میں مرکوز کر دیا اور اس کا نام "صورت" رکھا۔ پھر کہا کہ علت صوری جو کسی شے کی ماہیت ہے خود غایت کے اندر چھپی ہوئی ہے اور اسی میں سے پھوٹتی ہے کیونکہ کسی شے میں غایت کا تحقق اس کے صورت اختیار کرنے سے ہوتا ہے اور صورت کی بنیاد اس شے کی غایت پر ہوتی ہے اور جب علّت صوری، علّت غائی سے متحد ہو جائے، جیسا کہ گزر چکا تو یہ دونوں علت فاعلی سے آتی ہیں اس لیے کہ علت فاعلی کا اثر علت غائی اور صوری میں ظاہر ہوتا ہے، پس چارپائی اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کی غایت پہلے نہ ہو اور غایت قوت سے فعل کی طرف اس وقت آتی ہے جب چارپائی کو بنا لیا جائے اور اسے مخصوص صورت دی جائے اور فاعل یعنی بڑھئی بالفعل فاعل نہیں ہوا، جب تک اس نے چارپائی نہیں بنائی اس سے پہلے وہ فاعل بالقوۃ تھا۔ تینوں علتوں یعنی صوری، غائی اور فاعلی کو صورت میں مرکوز کرنے کے بعد اس کے پاس صرف علت مادی رہ جاتی ہے اور یہی مادہ یا ہیولیٰ ہے۔

جبران۔ میرے نزدیک اب تک تو ارسطو اس جہاں کی مختلف قسم کی اشیاء کی پیدائش کی تفسیر کرنے میں معقول جا رہا ہے لیکن چارپائی اور بڑھئی کی مثال اس جہان کی اصل پیدائش پر منطبق نہیں ہوتی۔ کیونکہ چارپائی کی لکڑی قطعی طور پر موجود ہے اور نجار نے اسے پیدا نہیں کیا، اس نے تو صرف اسے چارپائی کی شکل عطا کی ہے۔ پس لکڑی کو کس نے ایجاد اور پیدا کیا؟ بلکہ اس جہاں کے مادہ کو کس نے ایجاد کیا اور پیدا کیا اور اسے ہیولائی شکل کس نے عطا کی۔

شیخ۔ مادہ اور ہیولیٰ سے ارسطو کی وہ مراد نہیں جو ہم لفظ مادہ سے لیتے ہیں، کہ اس کی کم از کم شکل حجم اور وزن ہے لیکن ارسطو کے نزدیک ہیولیٰ کی مطلقاً کوئی صفت نہیں اور نہ وہ صورت کے سوا کسی اور سے اپنی صفات لیتا ہے۔ پس یہ صفات لینے سے پہلے کوئی ایسی شے نہ تھا جس کی صفت بیان کی جا سکے یا حد بندی کی جا سکے۔ یعنی یہ کہ ارسطو کے نزدیک ہیولیٰ محض بالقوۃ شے ہے۔ لیکن صورت قبول کر لینے کے بعد وہ بالفعل معین شے ہو جاتا ہے چنانچہ اس

کے نزدیک ہیولیٰ سے مراد تاثر قبول کرنے کی اہلیت ہے یہی وجہ ہے کہ جس نے مجھے تجھے یہ بتانے پر مجبور کیا کہ جس مادے کا ذکر ارسطو نے کیا ہے، اس سے مراد عدم ہے۔

حیران۔ لیکن مولانا یہ بات قابل فہم ہے اور نہ معقول ہی۔

شیخ۔ ہاں یہ نہ قابل فہم ہے اور نہ معقول۔ ارسطو کو خود معلوم ہے؟ یہ قابل فہم ہے نہ معقول یہی وجہ ہے کہ جہاں کی اصل کو مادہ اور صورت میں تقسیم کرنے کے بعد ہم اسے یوں کہتا ہوا دیکھتے ہیں۔ نہ مادہ کے بغیر صورت کے وجود کا تصور ہو سکتا ہے اور نہ صورت کے بغیر مادہ کا۔ پس ممکن نہیں کہ صورت مادہ کے سوا کسی اور میں ظاہر ہو اور نہ یہ ممکن ہے کہ مادہ صورت کے بغیر ظاہر ہو۔ ان کا اس طرح الگ الگ ہونا جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں محض ذہن کے اندر ہے۔ یہی اس کے فلسفہ مابعد الطبیعیات کی بنیاد ہے جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ عالم اپنے مادہ، صورت، حرکت اور محرک کے ساتھ قدیم ہیں۔

حیران۔ وہ محرک کون ہے جس نے عالم کو اس کی صورت اور حرکت دی؟

شیخ۔ ارسطو کہتا ہے کہ وہ اللہ ہے اور وہی علت صوری، علت غائی اور علت محرکہ ہے،

حیران۔ جب اللہ ہی علت صوری، غائی اور علت محرکہ ٹھہرا تو پھر اسی نے اس ہیولیٰ کو صورت عطا کی جو سوائے قابلیت تلقی کے سوا کچھ نہ تھا، جیسا کہ ارسطو کا خیال ہے۔ اس کے بعد اللہ ہی ہے جس نے جہان کو مع اس کے مادہ اور صورت کے پیدا کیا ہے جب یہ ہے تو پھر عالم کیسے اپنے مادہ، صورت اور حرکت کے ساتھ قدیم ہو سکتا ہے۔

شیخ۔ ارسطو اس تناقض سے مسئلہ قدم کے ذریعہ نکلنا چاہتا ہے وہ کہتا ہے کہ زمانہ کے اعتبار سے عالم پہلے کچھ نہیں عالم سے پہلے صرف اللہ ہی تھا جیسے نتیجہ سے پہلے "مقدمہ" ہوتا ہے اور اللہ اور عالم کا تعلق علت اور معلول کا تعلق نہیں ہے کہ اس میں زمانہ کا دخل ہو سکے، لیکن یہ تعلق منطقی ہے۔ اللہ نے عالم کو اس طرح وجود عطا کیا جس طرح مقدمہ نتیجہ کو وجود عطا کرتا ہے اور مقدمہ کا نتیجہ سے پہلے ہونا محض ذہنی ہے نہ کہ زمانہ کے اعتبار سے۔

جس چیز نے اسے عالم کے قدم پر اعتقاد رکھنے پر مجبور کیا وہ حرکت کا اعتقاد ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔

حرکت کی علت اولیٰ اللہ ہے جو دائمی ہے اور اسے ازل سے یہ قدرت حاصل ہے، لہٰذا اگر ہم کوئی ایسا وقت فرض کر لیں جس میں حرکت نہ تھی تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ کبھی حرکت نہ ہو اس لیے کہ حرکت کے نہ ہونے کے بعد یہ کہنا کہ حرکت پیدا ہوئی اس سے مراد یہ ہے کہ حرکت کا مرجح پھر سے پیدا ہو گیا اور اس نے حرکت کو واجب کر دیا حالانکہ محرک اول دائمی ہے اسے خود قدرت ہے اور اس بات کا تصور نہیں ہو سکتا کہ کوئی ایسا مرجح پیدا ہو۔ جو اس کے نزدیک حرکت کو ترجیح دے اور اس استدلال میں یہ غلطی اس لیے پیدا ہوئی کہ وہ صفت قدرت پر ٹھہر گیا اور صفت ارادہ کو بھول گیا، یہی وہ غلطی ہے جس نے بہت سے لوگوں کو دھوکا دیا ہے۔

جیسا کہ تو عنقریب دیکھے گا غزالی نے اس کا مسکت جواب دیا چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

یہ عالم اس قدیم ارادہ سے پیدا ہوا جس نے اس کے وجود کا اس وقت تقاضا کیا جس وقت یہ پیدا ہوا نیز یہ ارادہ کیا کہ عدم اس غایت تک اسی طرح چلا جائے۔ جس طرح پہلے تھا۔ اور یہ کہ علت کے قدیم ہونے سے معلول کا قدیم ہونا لازم نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ معلول اس قسم کا ہو کہ اس کا علت سے صادر ہونا ضروری امر ہو اور اس کا صادر رہونا ضروری ہو سکتا ہے جب معلول علت کے برابر ہو اور تغیر پذیر عالم اور اللہ کے درمیان برابری نہیں پائی جاتی کہ اس سے ضروری طور پر عالم صادر ہو۔ اس لیے حرکت کو قدیم کہنے کی کوئی گنجائش نہیں جیسا کہ ارسطو کا خیال ہے، لہذا یہ عقلاً ضروری نہیں اور نہ یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ از سر نو پیدا ہو گیا جیسا کہ اس کا خیال ہے کیونکہ ارادہ قدیم نے حرکت کا وقت مقرر کر رکھا تھا

حیران۔ یہ بیان تو نہایت واضح ہے۔ اس سے معلم کیسے غافل رہا؟

شیخ۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ پہلی فکری غلطی جس سے یہ تمام غلطیاں اور ہٹ دھرمیاں پیدا ہوئیں وہ عقلوں کے اس تصور سے عاجز ہونا ہے کہ مخلوق عدم سے کیسے پیدا ہو گئی اور زمان اور زمانہ کی حقیقت کے معنی کو سمجھنے میں غلطی کا لگنا ہے نیز وہ اشکال ہے جو انہیں مخلوق کی پیدائش سے پہلے "مدت ترک" کے متعلق پیدا ہوا۔ غزالی، ابن طفیل اور عمانوئیل کانت کے کلام میں تو عنقریب ان کی تردید دیکھے گا۔ مزید برآں جب تو ان تمام اقوال کا جو ارسطو نے علم اور فلسفہ کے متعلق کہے مطالعہ کرے گا تو تُو یہ پائے گا کہ اس شخص نے جب اپنی عقل کے ذریعہ سے مخلوق کے راز کو معلوم کرنے کا ارادہ کیا تو باوجود بڑی عقل اور وسعت علم کے غلط مباحث، اغلاط اور بہت سے تخیلات میں پڑ گیا جیسے کہ وہ دیگر متعدد غلط فہمیوں میں پڑا ہے لہذا تو اسے اس قدر مقدس اور معصوم نہ سمجھ جیسا کہ اس کے عاشق ابن رشد (۱) نے اسے سمجھا ہے۔ (مسلسل)

---

(۱) ابن رشد۔ محمد بن رشد شارح ارسطو۔ پیدائش ۱۱۲۶ء قرطبہ میں پیدا ہوا۔ فقہ ریاضی فلسفہ اور طب کی تعلیم حاصل کی اشبیلیہ اور قرطبہ میں قاضی رہنے کے بعد خلیفہ یعقوب یوسف کا طبیب بن گیا۔ یعقوب یوسف کے جانشین نے اسے الحاد کے الزام پر اپنے عہدہ سے برخاست کر دیا اس کی وفات مراکش میں ۱۱۹۸ء میں ہوئی۔ یہ ارسطو کا بہت دلدادہ تھا چنانچہ اس نے ارسطو کی تمام تصانیف کی شرح کی اس لیے اسے شارح ارسطو کہا جاتا ہے۔ ابن رشد قدم عالم کا قائل ہے نیز یہ کہتا ہے کہ عقل جو تمام مخلوق کے اندر پائی جاتی ہے، وہ در اصل ایک ہی چیز ہے۔ اس کے نزدیک ہر انسان میں عقل کے قبول کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے جو باہر سے آتی ہے۔ اس نے ایک نظریہ پیش کیا جسے (TWO-FOLD TRUTH) کہا جاتا ہے یعنی یہ کوئی مسئلہ مذہباً درست اور فلسفہ کے اعتبار سے غلط ہو سکتا ہے اور اس کے برعکس بھی۔